حنا جمشید* ڈاکٹر شازیہ عنبرین**

ادب اور ثقافت اور نو تاریخیت: ایک مطالعہ

Abstract: *New Historicism is a form of literary theory that claims that literature should be studied through its cultural context. This method of literary theory narrates that literature should be interpreted within the context of both literature and history. It also configures the power or ideology that influences the history in so many ways. Thus New Historicism has a huge literary influential approach on literary texts. This thing emphasizes to study the intellectual history with the help of literature and literature through its cultural context. This research article depicts that how New Historicism reveals and unfolds the facts of powerful ideologies. By identifying oppressed voices New Historicism denies the narrative of power, authority, prejudices and biases. This essay also throws light on the shallowness of the cotemporary political culture and the narrative of power with the help of this literary theory.*

تاریخ، ثقافت اور ادب کے باہم مربوط اور پیچیدہ رشتے کی تفہیم ابتداء سے جاری ہے۔ یہ تثلیث اپنی ابتداء سے ہی مختلف زمانی روایات کی تشکیل اور سماج میں ان کے نفاذ میں اپنا اہم کردار کرتی رہی ہے۔ دیکھا جائے تو ادب اور تاریخ کا رشتہ بیک وقت باہم متخالف بھی ہوتا ہے اور باہم متضاد بھی۔ بعض ناقدینِ ادب کے نزدیک یہ رشتہ جتنا سیدھا سادھا نظر آتا ہے اتنا ہی پیچیدہ، تہ دار اور کئی فلسفیانہ موشگافیوں کا سرخیل ہوتا ہے۔ ادب کو کلی طور پر آزاد اور خود مختار ماننے والے ناقدینِ ادب بھی اس بات سے اتفاق کرتے نظر آتے ہیں کہ تاریخی حقائق، واقعات، حادثات اور سانحات، وقت کی پیہم گردش کی طرح ادبی متون میں خود بخود اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ یقینی طور پر یہاں علت و معلول کا وہ رشتہ کار فرما نظر آتا ہے جہاں ایک مقام پر ادبی و تاریخی متن یکساں معنویت کے متحمل ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ان ادبی متون میں تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی وہ پیشکش ہوتی ہے جو اسے کسی بھی تاریخی متن کے متوازی لا کھڑا کرتی ہے۔

بسا اوقات ادبی متن اپنی بنت میں ایک نامیاتی کُل ہونے کے باوجود، اپنی اساس میں تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے وہ تمام اجزاء سمیٹے ہوئے ہوتا ہے، جن کی بدولت ادب اور تاریخ کا رشتہ مزید پیچیدہ ہو کر الجھ جاتا ہے۔ اس رشتے کی گرہوں کو کھولنے یا ان کی افہام و تفہیم کے لیے ایک ادبی نقاد کو، اس ادبی متن سے متعلقہ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی منظر نامے میں جھانک کر، تاریخ کی گرد کو

*پی ایچ ڈی اسکالر اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

**اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

ہٹاتے ہوئے، ان حقائق کو بازیافت کرنا ہوتا ہے، جنھیں دانستہ عام لوگوں سے دور رکھا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات نہایت اہم ہے کہ جن ادبی متون میں کسی خاص عہد کی تہذیب، معاشرت اور ثقافت ابھر کر سامنے آئے، ان کی تفہیم قطعی طور پر ایک ایسے عمیق اور آزادانہ تنقیدی شعور کی متقاضی ہوتی ہے جو کسی بھی قسم کے جانب دارانہ تصورات اور نظریات سے پاک ہو۔

ادب اور تاریخ کے قدیم لیکن پیچیدہ تعلق کی ہم بستگی پر کوئی منضبط تصور نہ ہونے کے باوجود بھی مختلف مفکرین اور ادبی ناقدین نے ان دونوں کے مابین متنوع تاریخی، تہذیبی، سماجی و ثقافتی تفاعلات کے تصورات کے تغیر و تبدل کی بات کی ہے۔ ادب اور تاریخ کا باہمی تعلق تغیر پذیر ہونے کے باوجود سماجی تحریک، تشکیل اور تجزیاتی اعادے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔ ادب میں پہلے ہیگل اور پھر مارکس کے اثرات کے تحت ادبی فن پاروں کی تفہیم میں تاریخیت کے عنصر کا کافی عمل دخل رہا، جسے بعد ازاں روسی ہئیت پسندوں نے اتنا ہی رد کیا۔ اردو ادب میں یہی تقابل ترقی پسند ناقدین اور جدیدیت پسندوں کے مابین جاری رہا۔ ایک طرف ادب میں ترقی پسندانہ رویوں کے تحت ادبی فن پاروں کو تاریخی و سماجی پس منظر کے نام پر ادبی تنقید کے عمل سے گزارا گیا جب کہ دوسری جانب جدیدیت کے نام پر ادب کے تاریخی مطالعہ جات کی سبھی راہیں مسدود کر دی گئیں۔ ادبی مطالعہ جات کے ان سطحی تنقیدی رویوں نے تنقید و تحقیق کے شعبہ جات میں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ دکھائی۔ واضح رہے کہ ان دنوں خالص ادب کے نام پر جو کچھ تخلیق کیا جارہا تھا اس میں بھی تاریخ، تہذیب اور گزرے ہوئے وقت کی بازگشت کا ہاتھ زیادہ تھا۔ تاہم یہ بات نہایت اہم ہے کہ اردو ادب میں جب نئی تنقید کے نام پر جدیدیت کے مباحث کا آغاز ہو رہا تھا، تب مغرب میں جدیدیت کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں۔ ساٹھ کی دہائی میں ساختیات اور پسِ ساختیات کے تنقیدی مباحث نے ادبی متون کی معنی خیزی کے عمل میں نئے ثقافتی تفاعلات کی راہیں کھول دیں۔

تاریخ چونکہ ماضی میں گزرے ہوئے واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ ان مخصوص ذہنی رویوں، طور طریقوں اور سوچنے کے زاویوں سے عبارت ہے جو کسی عہد کی مخصوص موضوعیت کو قائم کرتے ہیں۔ اسی لیے ناقدینِ ادب اور مؤرخین کے لیے یہ امر نہایت اہم اور ضروری ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کے کسی دوسرے عہد سے متعلقہ ادبی متن کی تفہیم و تنقید کے وقت، خود کو اپنے زمانے کے ان تمام تہذیبی، سیاسی، سماجی و ثقافتی تصورات، تعصبات اور نظریات سے بالائے طاق رکھ کر، اس عہد کا ایک حقیقی اور معروضی تجزیہ پیش کریں۔ تاریخی کے ایسے ہی موضوعی مطالعے اور ادبی متون سے اس کی معنی خیزی کے عمل کو مزید تقویت دینے کے ضمن میں کئی مابعد جدید تنقیدی رویے سامنے آئے، جن کے سبب نہ صرف ادب، تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے رشتوں کے مابین انضباطی عمل، پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو سکا بلکہ ادبی متون کے ذریعے تاریخ کے ان پوشیدہ گوشوں اور مستند حقائق تک بھی رسائی ممکن ہو پائی، جنھیں مؤرخین نے دانستہ تاریخ کے حاشیے سے باہر رکھا تھا۔

ساٹھ کی دہائی میں امریکہ میں ساختیات اور پسِ ساختیات کے نظریات کے تحت جب زبان اور ثقافت کے مابین ایک مربوط رشتے کی وضاحت کی گئی تب اس بات کو بھی واضح کیا گیا کہ زبان کی مانند ادب بھی ثقافت کا پروردہ ہے، اور یہ دونوں ہی عناصر تاریخ کے

محور پر قائم ہیں۔ پسِ ساختیات میں معنی آفرینی کے اس عمل سے ثقافتی مطالعہ جات کی وہ راہ ہموار ہوئی جس نے بعد ازاں ادب میں نو تاریخیت جیسے نئی تنقیدی رجحان کو متعارف کروایا۔ نو تاریخیت دراصل ادب، ثقافت اور تاریخ کے باہمی مربوط رشتے کو، ادبی متون کے مطالعے سے سمجھنے کا ایک ایسا عمل تھا، جس نے تاریخی حقائق کی تحقیق، تنقید، تفہیم اور بازیافت کے عمل کو پہلے سے کہیں زیادہ سہل بنا دیا۔ ڈاکٹر کرسٹی سیگل اصطلاحات سے متعلق اپنی کتاب ادب میں نو تاریخیت کا تعارف یوں کراتے ہیں: Introduction to Modern Literary Theory:

> "New Historicism views history skeptically but also more broadly; history includes all of the cultural, social, political, anthropological discourses at work in any given age, and these various "texts" are unranked. Any text may yield information valuable in understanding a particular milieu. Rather than forming a backdrop, many discourses at work at any given time affect both an author and his/her text; both are inescapably part of a social construct."(1)

تاریخ محض ماضی میں گزرے واقعات کا بیان نہیں، درحقیقت یہ ان مؤرخین اور واقعات نگاروں کے بیانات کا مجموعہ ہوتی ہے جو مقتدر بیانیوں کے زیرِ اثر متشکل ہوئے ہوتے ہیں۔ کسی بھی تاریخی واقعے کا بیان ہم تک ایسے مؤرخین کے طفیل پہنچتا ہے جو خود مخصوص قسم کے مذہبی، سیاسی و سماجی نظریات و تصورات کا داعی ہوتا ہے، تاریخ کے یہ بیانات اُس عہد کے ان مخصوص مقتدر بیانیوں کے تحت متشکل ہوتے ہیں، جو سماج کی بنیادی ثقافت کو بھی اپنی منشاء سے ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نو تاریخیت مابعد جدیدیت کے تحت سامنے آنے والے تنقیدی رجحانات میں، اسی لیے خصوصی طور پر نمایاں ہے، کہ اس تنقیدی رجحان کے تحت نہ صرف کسی بھی فن پارے کی تفہیم و تجزیہ آسان ہو جاتا ہے بلکہ تاریخ کے کسی خاص عہد سے متعلقہ معروضی حقائق سے بھی آگہی مل جاتی ہے۔ عمومی طور پر تاریخ کے وہ حصے جو ہم تک پہنچائے جاتے ہیں، وہ ان مخصوص و مقتدر ذہنی، جذباتی و فکری رویوں اور عقائد کے تابع ہوتے ہیں، جن سے کسی بھی عہد کا مؤرخ متاثر ہوتا ہے۔ تاریخ کے یہ تعصبات جہاں تاریخ کے حقائق کو دھندلا دیتے ہیں بلکہ ان اضافی حقائق کو تاریخ کے حاشیے سے باہر قرار دیتے ہیں جو مقتدر طبقات کی منشاء سے بعید ہوتے ہیں۔ نو تاریخیت ادبی متون کے ذریعے تاریخ کے انہی پیچیدہ حقائق کی بازیافت کا، ایک ایسا عمل ہے جو تاریخ کے معروضی مطالعے کو آسان بناتے ہوئے، اس کی غیر جانب دارانہ تفہیم، تنقید اور تجزیے کو آسان بنا دیتی ہے اور تاریخ کا ایک نیا روشن تصور سامنے لاتی ہے۔ نو تاریخیت کی درج ذیل تعریف درج کی گئی ہے: Dictionary of Literary Terms۔ اسی حوالے سے دیکھا جائے تو:

> "It brackets together literature, ethnography, anthropology, art, history and other disciplines and other sciences in such a way that its politics, its novelty, its historicality, and its relationship to other prevailing ideologies all remain open questions. New Historicists underscore a principled flexibility, a sharp eye to the distortion in all perspectives."(2)

امریکہ میں نو تاریخیت کے مباحث کو متعارف کرانے کا سہرا، کیلیفورنیا یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے اسٹیفن گرین بلاٹ کے سر ہے۔ 1987 میں اسٹیفن گرین بلاٹ نے پیش کیا، اس مضمون میں اس نے نو تاریخیت کے ان مباحث پر روشنی ڈالی، جو Towards a Poetics of Literature نو تاریخیت پر اپنا نہایت اہم اور معلوماتی مضمون ادبی متن اور تاریخ کے باہمی تعلق پر سوال اٹھاتے ہوئے، کسی بھی عہد کے متخالف اور پیچیدہ ادبی متون کی تفہیم کے لیے ضروری تھے۔

اسی کی دہائی میں اسٹیفن گرین بلاٹ اور اس کے رفقاء نے سولہویں صدی سے متعلقہ نشاۃ الثانیہ کے ادب کا تاریخی و ثقافتی تناظر میں جائزہ لیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے رسالے کا خصوصی نمبر شائع کیا، اور ادب کی بنت میں شامل تمام ثقافتی ظواہر پر کھل کر لکھا۔ اسٹیفن گرین بلاٹ نے ادب کی داخلی خود مختاری اور کلی آزادی کے تصور کو رد کیا۔ اس کے نزدیک ادب کبھی بھی اپنے سیاسی، ثقافتی اور سماجی اثرات سے مبرا نہیں ہوتا۔ وہ ادب کی موضوعیت، ثقافتی شعریات اور سماجی تفاعلات کا قائل ہے۔ اس نے نو تاریخیت کے پس منظر میں کارفرما پس ساختیاتی فکر کی بدولت، اسے ادب، ثقافت اور تاریخ کی تفہیم سے مشروط کیا۔ نو تاریخیت کے ان مباحث کے بارے میں مزید تفصیل اسٹیفن گرین میں بھی ملتی ہے۔ یہ وہی مشہور و معروف کتاب تھی، جس میں اس نے Renaissance self-fashioning بلاٹ کی 1980 میں شکاگو سے شائع ہونے والی کتاب سولہویں صدی سے تعلق رکھنے والے الزبتھ عہد کے فن پاروں کا ثقافتی مطالعہ کیا تھا۔ یہ مطالعہ تاریخ کے ان مستور پوشیدہ حقائق سے متعلق تھا، جن کی شناخت اور بازیافت کے لیے اس نے سولہویں صدی کے نشاۃ الثانیہ کے ادبی متون کا انتخاب کیا تھا۔ وہ کسی بھی فن پارے کی تفہیم کو اس کے ثقافتی تناظر سے کاٹ کر دیکھنے اور پرکھنے کے خلاف ہے۔ شامل ہیں۔ Louis Montrose, Stephen orgel, Jonathan Goldberg , Lisa Jardine اسٹیفن گرین بلاٹ کے اہم اور نمایاں رفقاء میں اسٹیفن گرین بلاٹ نے اپنی تحقیق سے جو اہم بات منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی وہ ادبی متون میں تاریخ کی مختلف صداقتوں کی کھوج کا ایسا عمل تھا، جسے اُس نے خود نشاۃ الثانیہ میں شیکسپیئر کے ڈراموں کے مطالعے سے حاصل کیا تھا۔ وہ یہ بات صاف بتانا چاہتا تھا کہ کسی بھی عہد کے ادبی متون اور اس کی ثقافتی شعریات میں ایسا پوشیدہ، ملفوف و مستور تعلق ہوتا ہے، جو اس عہد کے مقتدر بیانیوں کے، اس ادبی متن کے تخلیق کرنے والے ادیب یا تخلیق کار کے ذہن پر، شعوری یا لاشعوری سطح پر نقش ہو جانے کے بعد، اس کی تخلیق میں دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے اسٹیفن گرین بلاٹ کے نزدیک تاریخ کے پوشیدہ حقائق کی بازیافت کا عمل ایسا آسان یا سہل نہیں ہوتا تاہم ان ادبی متون کا نو تاریخی مطالعہ، جب تاریخ کے کسی متن کے ساتھ متصل کر کے کیا جائے، تو تاریخ کے کئی نئے مفاہیم اور حقائق سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس نے تاریخی اور ادبی متون کے تعلق پر بات کرتے ہوئے اپنے ایک نہایت اہم مضمون میں لکھا کہ:

> "We need to develop terms to describe the ways in which material--, here official documents, private papers, newspaper clip pings, and so forth- is transferred from one discursive sphere to another process as un-directional-- from social discourse to aesthetic discourse- not only because the aesthetic discourse in this case is so entirely bound up with capitalist venture but because the social discourse is already charged with aesthetic energies."(3)

امریکہ کے ساتھ برطانیہ میں اگر دیکھا جائے تو وہاں نئی تاریخیت کے مباحث کا آغاز کرنے والوں میں جو سب سے اہم اور نمایاں نام سامنے آتا ہے وہ برطانوی مارکسی نقاد ریمنڈ سے ثقافتی مادیت کی اصطلاح مستعار لی۔ Marxism and Literature 1977 ولیمز کا ہے۔ ابتداء میں جوناتھن ڈولی مور نے رمنڈ ولیمز کی کتاب یہ وہی کتاب تھی جس میں ریمنڈ ولیمز نے اپنی نئی ثقافتی مارکسی تھیوری وضع کی تھی اور ادب اور سماج کے باہمی تعلق پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ ریمنڈ ولیمز مارکسی نظریات کے تحت ادبی متون کے ثقافتی مطالعہ جات کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور تاریخی متون کو وہ مقتدر بیانیہ قرار دتا ہے جو ہم تک مختلف مؤرخین نے طاقت کی مرضی و منشاء کے مطابق پہنچایا۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

"We cannot separate literature and art from other kinds of social practice, in such a way as to make them subject to quite special and distinct laws." (4)

برطانیہ میں ثقافتی مادیت کے بنیاد گزاروں میں جوناتھن ڈولی مور، کیتھرین بلسے، فرانسس بیکر اور ایلن سنفیلڈ جیسے نمایاں ناموں نے اس رجحان کی تقلید کرتے ہوئے ادبی فن پاروں کا ثقافتی مطالعہ کرنا شروع کیا۔ دیکھا جائے تو امریکی نو تاریخیت اور برطانوی ثقافتی مادیت دونوں نے ہی ادبی متون کے مطالعے سے تاریخی واقعات کے استناد اور حقائق کو جاننے کی سعی کی اور ادب اور تاریخ کے مابین ایک ایسا مربوط و منضبط تعلق پیدا کیا کہ جس کی بدولت ادبی متون کی اہمیت اور شہادت تاریخی متن کے برابر ہو گئی۔ چند ایک معمولی اختلاف کے بعد دونوں مکاتیبِ فکر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم تک پہنچائی جانے والی تاریخ، در حقیقت ماضی میں گزرے واقعات کا وہ بیان ہے، جو مختلف مؤرخین نے مقتدر طبقات کی مرضی سے متشکل کیا ہے، ان بیانات پر واضح رنگ انہی مقتدر بیانیوں کا ہے جو سماجی، ثقافتی، سیاسی اور مذہبی بنیادوں پر، طاقت کی منشاء کے مطابق سماج میں سرایت کر جاتا ہے اور ان مخصوص ذہنی اور فکری نظریات کی آبیاری کرتا ہے جو مقتدر قوتوں کی منشاء اور مفاد کے مطابق ہوں۔

ان ادبی مباحث نے جہاں تاریخ کی قطعیت اور حتمیت کے تصور کو پسِ پشت ڈالا وہیں سماج کے کسی بھی مؤرخ یا گروہ کی جانب سے تاریخ کے مختلف واقعات یا مختلف عہد کے بارے میں کیے گئے استناد کے دعووں کو باطل قرار دیا۔ یوں اگر دیکھا جائے تو جو ایک بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ نو تاریخیت کا، تاریخ کو ایک محض ایک متن کی شکل میں دیکھنے کا وہ نظریہ ہے، جو اسے تاریخ کے ایک بیانیے سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں۔ یہاں اگر کسی چیز کی اہمیت ہے تو وہ ادبی متون ہیں، جو کسی بھی عہد کی معروضی تاریخ کے حقیقی عکاس ہیں۔ نئی تاریخیت کے مضمرات میں اہم بات، اس کا ادب کو ثقافتی ظواہر کے تحت وضع کرنے کا نظریہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے نزدیک خود ادب بھی ثقافتی تفاعلات کو وضع کرتا ہے۔

نو تاریخیت کسی بھی ادیب یا تخلیق کار کو اس کی ثقافتی شعریات کا پروردہ قرار دیتی ہے۔ وہ اس کے تمام افکار و نظریات نیز تخلیقی عمل کو بھی اسی ثقافت سے مربوط قرار دیتی ہے۔ نو تاریخیت مابعد جدیدیت کے زیرِ اثر رواج پانے والے ان تنقیدی رجحانات میں سب سے

زیادہ اہم ہے جو فن، ثقافت اور ادب سے وابستہ سیاسی، سماجی و تہذیبی تصورات کو غیر جانب دارانہ طریقے سے پرکھتے ہوئے انھیں تاریخ کے مقتدر بیانیوں کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ نو تاریخیت ادبی متون کی تفہیم کے دوران اس عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی تصورات کا مطالعہ کرتے وقت یہ دیکھتی ہے کہ کسی بھی مخصوص عہد کے یہ مقتدر عناصر جنھیں اس عہد کی بااختیار قوتیں متشکل کرتی ہیں، وہ ادبی متون پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں، یا ان عناصر کے سبب ادبی متون میں کسی قسم کی مزاحمت جنم لیتی ہے، نیز یہ بھی کہ ادبی متون میں ان رجحانات کی واضح یا مستور و ملفوف عکاسی پر ان قوتوں کی جانب سے آنے والا جبر کا رد عمل بھی نو تاریخیت کا اہم موضوع ہے۔ ان تمام عناصر کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو ادبی و تاریخی متون کے باہم موجود پیچیدہ رشتے کی تفہیم ہی نو تاریخیت کا اہم موضوع ہے۔ بقول اسٹیفن گرین بلاٹ:

> "A Working distinction between cultural texts that are social and political and these that are not, that is an aesthetic domain that is in some way marked off from the discursive institutions that are operative elsewhere in a culture, becomes a malignant symptom of "Privatization", why should the private immediately enter into this distinction at all?" (5)

نو تاریخیت ادبی متن کو اپنی بنت میں ایک مکمل نامیاتی کُل قرار دینے کے باوجود ثقافت کو کلیت پسندانہ نظام قرار نہیں دیتی۔ وہ ثقافت کو ان مقتدر قوتوں کے متشکل کیے گئے سیاسی، سماجی، مذہبی و تہذیبی تصور کا وہ نظریہ قرار دیتی ہے جو کسی بھی ادبی متن پر اثر انداز ہونے کا اہل ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادیب یا تخلیق کار اس مخصوص ماحول میں ہی اپنی زندگی گزارتا ہے جو طاقت کے بیانیوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔ طاقت کے یہ منابع اس ماحول کی صورت گری خود کرتے ہیں اور اسے اپنی منشاء و مفاد کا وہ رنگ دیتے ہیں جو خود ان کے لیے سود مند ہو۔ اسی لیے جب وہ ادیب یا تخلیق کار اپنے تخلیقی عمل سے گزرتے ہوئے کوئی بھی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو لامحالہ طور پر اس کے ارد گرد کا ماحول، اس کا پس منظر و پیش منظر، سب اس کے ادبی متن میں در آتا ہے۔ یہ عمل شعوری و لاشعوری دونوں کیفیات کے تابع ہو سکتا ہے، تاہم اس عمل کے تحت اس عہد کے مقتدر بیانیوں کا وہ جبر اور عکس، جو اس فن پارے کی بنت یا اساس میں کسی روزن یا شگاف کی صورت رہ جاتا ہے، اس کی کسی دوسرے عہد میں تلاش یا بازیافت کے عمل کو نو تاریخیت سہل بنا دیتی ہے۔

نو تاریخیت تاریخ کو محض ایک متن قرار دیتے ہوئے اس میں بیان کیے گئے واقعات کے 'بیانات' کو اپنے تجزیے کا مرکز بناتی ہے۔ اور ادب اور تاریخ کے مابین ان بیانات کو متشکل کرنے والی مقتدر قوتوں کا کھوج لگاتے ہوئے طاقت کے اس کھیل کی نشاندہی کرتی ہے جو تاریخی حقائق کو اپنی مرضی سے وضع و مرتب کرتے ہیں اور عوام کو غیر محسوس انداز سے ذہن سازی کے ان مراحل سے گزارتے ہیں، جن کے بعد انھیں خود پر مسلط کیے گئے جبر کے بیانیوں کا قطعی احساس و ادراک نہیں رہتا۔ یوں مقتدر قوتوں کی منشاء و مرضی کے مطابق تاریخی متون کی متن سازی کرنے والے مؤرخین تاریخ حقائق کو دھندلا، غیر شفاف اور مبالغہ آمیز کر دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

نو تاریخیت کے ان تصورات کو مزید واضح کرنے میں فوکو اور لوئی آلتھیوسے کے ناکافی نمایاں ہیں۔ یہ مقتدر قوتوں کے اُن نظریاتی بیانیوں کی، سماج میں نفوذ پذیری اور ذہن سازی کے عمل پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں جو مقتدر قوتوں کی اجارہ داری و استعماریت کے کام کو مزید سہل بنا دیتے ہیں۔ فوکو اور لوئی آلتھیوسے کے ان خیالات اور اسٹیفن گرین بلاٹ اور اس کے رفقاء کے نو تاریخیت کے بنیادی مباحث کی بدولت، سولہویں صدی میں، الزبتھ عہد کے ادبی متون کی نو تاریخی قرات نے اس عہد کی تاریخ کے کئی نئے حقائق کو آشکار کیا۔ انھوں نے اس عہد کی بادشاہت کے اس مقتدر نظام کو بے نقاب کیا، جو طاقت کا تسلط برقرار رکھنے کے لیے عوام پر مختلف قسم کی مذہبی، سیاسی و ثقافتی تصورات و نظریات کی صورت مسلط کیا گیا تھا۔ یوں گرین بلاٹ کے شیکسپیئر کے ادبی متون کی قرات نے تاریخ کو ایک نئے سر سے متاثر کیا۔

فوکو مقتدر بیانیوں پر بات کرتے ہوئے انھیں وضع کرنے والے ان طاقتور طبقات کی بات کرتا ہے، جو اپنے مفادات کے حصول کے لیے ان بیانیوں کو مختلف نظریات و تصورات کی صورت وضع کرتے ہیں، اور انھیں سماج میں تہذیب و ثقافت کی صورت متشکل کرتے اور رواج دیتے ہیں۔ فوکو کے نزدیک سماج میں ان مقتدر نظریات کو رواج دینے اور عوام کی ایک مخصوص قسم کی ذہن سازی کے دوران، کسی بھی عہد کی مقتدر قوتیں، ان تمام مذہبی، سیاسی، سماجی، قانونی و تعلیمی اداروں کو استعمال کرتی ہیں جو مقتدر بیانیوں کی رجحان سازی کے عمل میں ان کی مدد کر سکیں۔ فوکو ان ریاستی و معاشی اداروں کو، طاقتور طبقات کے سہولت کار کے طور پر دیکھتا ہے۔ جو مقتدر بیانیوں کو نہ صرف سماج میں اثر پذیر ہونے میں مدد دیتے ہیں، بلکہ طاقت کے ان طبقات کو مضبوط و توانا بناتے ہیں، جو کسی عہد کی عوام کو اپنے مذموم استعماری مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ فوکو طاقت کی اس نفسیات کی بات کرتا ہے، جو اشرافیہ اور مقتدر طبقات کے بنائے گئے سماجی، معاشی و مذہبی معیارات کو متشکل کرتی ہے اور عام لوگوں کو جبر کے اس بیانیے سے گزارتی ہے جس سے نکلنے کا ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

مثل فوکو اور آلتھیوسے دونوں تاریخ کو مقتدر قوتوں کا ایک بیان مانتے ہوئے، اس کی بنیاد ان مقتدر نظریات پر قرار دیتے ہیں جو وضع ہی عام آدمی کے لیے کیے جاتے ہیں، تاکہ اس کے ذہنی و فکری تصورات کو زیادہ دیر تک قابو میں رکھا جا سکے۔ نو تاریخیت ادبی متون کی تہ میں موجود طاقت کے ان مقتدر نظریات اور تصورات تک رسائی چاہتی ہے جو کسی بھی سماج میں سیاسی، معاشی، مذہبی و نظریاتی حوالے سے اپنے پھیلاؤ کا عمل جاری رکھتے ہیں۔ فوکو علم کو بھی طاقت کا ایسا ہتھیار قرار دیتا ہے، جسے مقتدر قوتیں گاہے بگاہے مختلف صورتوں میں اپنے حق کے لیے استعمال کرتی ہے۔ اس کی واضح شکل سماجی و ریاستی اداروں کی ہے جہاں مختلف عدالتیں، اسکول، مذہبی تعلیم دینے والے مدارس اور قانونی ادارے سب شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب فوکو سماجی و ریاستی اداروں کی بات کرتا ہے تو اس کی مراد حاوی بیانیوں کی یہی مقتدر شکل ہوتی ہے، جو نہ صرف کسی سماج کے افراد یا عوام کی موضوعاتی حیثیت کا تعین کرتی ہے، بلکہ ان کے لیے طاقت و استعماریت کا وہ بیانیہ ترتیب دیتی ہے جو انھیں مزید پستی کی جانب دھکیل دیتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مقتدر قوتوں کے متشکل کیے گئے مخصوص ذہن سازی کے عمل سے گزرنے کے بعد، استحصالی طبقات کو اس چیز کا بھی احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ طاقت کے حاوی بیانیے کے تابع اپنے شب و روز گزار رہے ہیں۔

فوکو اپنی کتاب 'آرڈر آف تھنگز' میں تاریخ میں طاقت اور استعماریت کے اسی جبر پر سوال اٹھاتا ہے۔ وہ تاریخ کا مطالعہ ثقافت کے ان ظواہر کے تحت کرنے پر زور دیتا ہے جو مختلف ادبی متون میں کسی خلاء، روزن یا شگاف کی مانند رہ گئے ہیں۔ فوکو ادبی متون کے اسی خلاء یا روزن پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہوئے تاریخ کی تعقل پسندی یا تفکر پسندی پر سوالات اٹھاتا ہے۔ اور مختلف ادبی متون کے پس منظر میں موجود تاریخی، تہذیبی و ثقافتی اثرات کی تفہیم پر زور دیتا ہے جو مختلف تاریخی واقعات کے استناد اور حقائق کی جانب راہنمائی کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب آرکیالوجی آف نالج میں علم اور طاقت کے اسی رشتے پر سوال اٹھاتا ہے:

> "We must also question those divisions with which we have become so familiar. Can one accept, as such, the distinction between the major types of discourse, let alone when we are analyzing groups of Statements which, when first formulated, were distributed, divided and characterized in a quite different way."(6)

نو تاریخیت ادب اور تاریخ کے باہمی تعلق کو بنیاد بناتے ہوئے تاریخ کی موضوعیت پر کئی سوال اٹھاتی ہے، جس میں ادب اور تاریخ کی ترجیحات کو خصوصی طور پر موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے۔ وہ ادب اور تاریخ کے باہم متصل ہو جانے کے عمل سے سامنے آنے والے ان نظریات و تصورات کی بات کرتی ہے جن کی تشکیل مقتدر بیانیوں کے سبب ممکن ہو پائی۔ وہ ادب اور تاریخ کے سیدھے سادھے رشتے سے احتراز کرتے ہوئے ادبی متن کو، تاریخ کے اس خارجی منظر نامے سے منسلک قرار دیتی ہے، جو اس کی تخلیق و تشکیل کا سبب بنا۔ وہ متن اور مقتدر بیانیوں کی حقیقیت کو تاریخ کے ایک منطقی اور ناگزیر رشتے میں بندھا ہوا دیکھتی ہے۔ فوکو اور آلتھیوسے کے طاقت کے نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے، نو تاریخیت ادب اور تاریخ کے ان پیچیدہ رشتوں کی بات کرتی ہے جو راست نہ ہونے کے باوجود نہایت گہرے اور پوشیدہ ہیں۔ وہ ان رشتوں کی مضبوطی کو ادبی متون میں تہ در تہ منعکس ہوتا دیکھتی ہے۔ بقول پروفیسر عتیق اللہ:

> "نو تاریخیت قرات کا ایک خاص طریقہ ہے، جس کا اصرار متن کے نہایت غائر مطالعے پر ہے۔ نو تاریخیت یہ بتاتی ہے کہ کسی بھی فن پارے کو کس طرح سے پڑھنا چاہئے اور دیگر متون جس طرح اقتصادیات، طبی دستاویز اور قانونی کتابچوں وغیرہ کے علاوہ متنی سیاقات کی روشنی میں اس کی تفہیم کس طرح کی جا سکتی ہے۔"(۷)

دیکھا جائے تو نو تاریخیت، ثقافت، ادب اور تاریخ کے ان پیچیدہ لیکن موجود رشتوں کے سلجھانے کا نام ہے۔ نو تاریخیت ادب کا مطالعہ سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور ثقافتی نظریات اور تصورات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کرتی ہے اور مقتدر قوتوں کے ان بیانیوں کا سراغ لگاتی ہے جو سماجی ناہمواریوں کو بھی اپنے مفادات کی شکل میں استعمال کرتے ہیں۔ عموماً تاریخ کے متون میں یہ دکھایا جاتا ہے، کہ کس طرح ایک حاوی و غالب نظریہ، اپنے عہد میں واقع دیگر متبادل نظریات کو یکسر مسترد، مدغم یا بالکل ختم کر دیتا ہے اور خود کو خوشنما اور بہتر قرار دے کر باقی سب پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے، سماج میں اس خوشنما، غالب اور حاوی نظریے کو پذیرائی دینے والے طبقات دراصل مقتدر قوتوں کی ہی ایماء پر یہ کام سر انجام دیتے ہیں، اور ان کے مفاد پرست غالب نظریات کو ایک خاص قسم کی ذہن سازی کے ساتھ فروغ

کرتے ہیں۔ یہ مقتدر قوتیں، اپنے متشکل کیے گئے بیانیوں کی بدولت نہ صرف اپنی ماضی کی لغزشوں پر پردہ ڈالنے میں ماہر ہوتی ہیں بلکہ طاقت اور اقتدار کے بل پر مزاحمت کرنے والی ان عوامی قوتوں کا راستہ بھی مسدود کر دیتی ہیں، جو طاقت کے ان بیانیوں کے خلاف متحد ہو جائیں۔ اسی حوالے سے جون بنیگان لکھتا ہے کہ:

> "This is not to say that there is no resistance, or as it is more usually termed in new historicist writing subversion. But subversion is always produced in the interests of power, according to new historicists…. Power needs to have subversion otherwise it would be without the opportunity to justify itself and to make itself visible as power."(8)

نو تاریخیت کے ان تمام رجحانات، تصورات اور نظریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، اگر اس نو تاریخی مطالعاتی طریقِ کار کا اطلاق پاکستانی اردو ادب کے تخلیقی متون پر کیا جائے تو پاکستان کی عصری تاریخ کے کئی واقعات کا حقیقی استناد حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک ہماری تاریخ اپنے حقائق کے استناد کے حوالے سے جن مخمصوں اور مقتدر بیانیوں میں گھری رہی، ان کی درست شناخت بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ پاکستان کے ایسے ادیبوں اور تخلیق کاروں کے ادبی متون جو اپنے گہرے سیاسی و سماجی شعور کی بدولت تاریخ کی حقیقی فہم اور بصیرت رکھتے ہیں اور پاکستان کی عصری تاریخ کے حالات، واقعات اور سانحات کو ایک خاص تخلیقی عمل سے گزار کر اپنے ادبی و تخلیقی متون کا حصہ بناتے رہے ہیں، ان ادیبوں اور تخلیق کاروں کے تخلیقی ادبی متون کی نو تاریخی قرات، پاکستان کی تاریخ کی ان صداقتوں اور حقائق کو منظرِ عام پر لا سکتی ہے، جنھیں مقتدر طبقات نے دانستہ عام لوگوں کی رسائی سے محدود رکھا اور پاکستان کی تاریخ کا، بظاہر ایسا عوامی بیانیہ تشکیل دیا جو خالصتاً مقتدر قوتوں کے مفادات کا ترجمان ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی عصری تاریخ کے حقائق کی بازیافت کے لیے اگر پاکستان کے تخصیصی ادباء کے منتخب ادبی متون کا نو تاریخی مطالعہ کیا جائے تو تاریخ کی گرد میں دانستہ روپوش کیے گئے، پاکستان کی سیاسی، سماجی، مذہبی و تہذیبی تاریخ کے کئی حقائق منظرِ عام پر آ سکتے ہیں۔

پاکستان کی عصری تاریخ رقم کرتے وقت جو ایک مشکل ہمیشہ سے درپیش رہی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی عصری تاریخ کس طور مرتب کی جائے؟ مزید یہ بھی کہ عصری تاریخ کے حقائق کو ترتیب دیتے وقت، تاریخ کے استناد کی بازیافت کے لیے کن متون کو بنیاد بنایا جائے؟ پھر یہ بھی کہ وہ تمام تاریخی متون جو ابتداء سے ہی مقتدر قوتوں کی منشاء کے مطابق تاریخ کی شیرازہ بندی کا کام سرانجام دیتے رہے ان پر کتنا بھروسہ کیا جائے؟ یا یہ بھی کہ ان مقتدر طبقات کے منتخب کیے گئے مؤرخین کے ہاتھوں مرتب کی گئی تاریخ کے کن واقعات کو مستند قرار دیا جائے اور کن کے بیاناتی موقف کو خود مؤرخین، یا مقتدر بیانیوں کے مخصوص مقتدر نظریات و تصورات کے تابع قرار دیا جائے؟ یہاں ایک اور سوال نہایت اہم ہے کہ کیا مقتدر طبقات کی متشکل کی گئی تاریخ کے متوازی، تاریخ کا حقیقی بیان قابل قبول ہو گا؟ نیز یہ بھی کہ متبادل بیانیوں کی پیشکش میں کہیں تاریخ کا حقیقی رنگ گہنا تو نہیں جائے گا؟ یقینی طور پر ان تمام سوالوں کا جواب ان ادباء اور تخلیق کاروں کے، ادبی متون کے پس منظر و پیش منظر میں پوشیدہ ہے، جسے انھوں نے بڑے سلیقے سے اپنے ادبی متن کی بنت یا اساس میں سمو دیا ہے۔ یہاں یہ بات

جان لینا ازِ حد ضروری ہے کہ پاکستان کی عصری تاریخ میں کئی دہائیوں پر مشتمل، مقتدر طبقات کے اس مقتدر بیانیے کو رد کرنا ایسا آسان نہیں۔ یقینی طور پر اس کی وجہ دہائیوں سے، غیر محسوس انداز میں سماج میں ان بیانیوں کے متشکل ہونے، سرایت کر جانے اور نفاذ کیے جانے کا وہ عمل ہے، جو عوام کو مذہبی، سیاسی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی لبادوں میں ملفوف کر کے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے حاوی بیانیوں کی ترسیل کا یہ عمل جو خود کئی دہائیوں پر مشتمل ہے، عوام کے اذہان میں اتنا پختہ اور راسخ کر دیا جاتا ہے کہ انھیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک غالب مقتدر بیانیے کے زیرِ اثر اپنی زندگی کے معمولات سرانجام دینے پر لگا دیے گئے ہیں۔

تاہم حالات کے اس جبر کے ساتھ ساتھ، تسلسل سے جاری مزاحمت کا وہ عمل ہوتا ہے جو مقتدر بیانیوں کو سماج میں اپنے پھیلاؤ اور نفاذ سے روکتا ہے۔ مزاحمت کی اس طاقت کا سرا، عوام کے ان باشعور طبقات سے جا ملتا ہے جو جبر کے ان بیانیوں کے خلاف ابتداء سے ہی اپنی جدوجہد ایک مزاحمت کی صورت جاری رکھے ہوتے ہیں۔ بسا اوقات حالات کے جبر کے ہاتھوں مجبور ہو کر، یا مقدر قوتوں کی شر انگیزی اور اجارہ داری سے خود کو محفوظ رکھنے کی خاطر مزاحمت کا یہ عمل ادبی متون میں کھل کر یا واضح ہو کر سامنے نہیں آتا، بلکہ متن کی ان تہوں میں ملفوف و مستور کر دیا جاتا ہے، جو تاریخ کے ان حقائق کے استناد کا واحد ذریعہ ہوتے ہیں۔ بقول فوکو:

> "Discourse appears as an ascent..finite. limited, desirable, useful.. that has its own rules of appearance but also aits own conditions of appropriateness and operation." (9)

ایسی صورتحال میں مستند تاریخ تک رسائی نہ صرف مشکل ہو جاتی ہے، بلکہ مقتدر بیانیوں کے زیرِ اثر تاریخی صداقتوں کو اپنی گرفت میں لینے والے ان مقتدر بیانیوں کا تعین بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اس صورتحال میں اُن ادباء کے تخلیقی تخصیصی متون کا نو تاریخی مطالعہ، تاریخ کا ایک متبادل بیانیہ تشکیل دے سکتا ہے جو اپنے معاشرے کے ضمیر کی تخلیقی آواز ہوں۔ نو تاریخیت ان ادباء کے تخلیقی متون کے مطالعے کو، تاریخ کی ایک مستند اساس فراہم کرنے کا وسیلہ سمجھتی ہے۔

پاکستان کی عصری تاریخ کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو ادب میں ایسے کئی قابلِ ذکر ادباء اور تخلیق کر گزرے جنھیں پاکستان کا حقیقی تخلیقی ضمیر کہا جائے تو بے جا نہیں۔ برطانوی استعماریت سے آزادی کے بعد تقسیمِ ہند کی شکل میں، ایک آزاد اور خود مختار ریاست کی شکل میں وجود میں آنے والا ملک، جو اپنی ابتداء سے ہی کئی مسائل، مشکلات اور پریشانیوں کا شکار رہا۔ تاہم بعد ازاں بجائے کہ یہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتا، اس کے مسائل میں روز افزوں ہونے والے اضافے اور داخلی سطح میں ملک میں پیدا ہونے والی بد نظمی، سیاسی و سماجی برائیوں، اقرباء پروری، سیاست دانوں کی نااہلی، کشمیر کی شکل میں ایک مستقل رسنے والا زخم، ہندوستان کے ساتھ ہونے والی ابتدائی جنگوں کے ساتھ ساتھ سب سے تکلیف دہ سانحہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی جیسے واقعات نے، پاکستان کی عصری تاریخ کو اپنی ابتداء سے ہی ،ایک کے بعد ایک ایسے تلخ واقعات و سانحات سے نوازا کہ اس بات کا سراغ لگانا ضروری ہو گیا، کہ پاکستان کی سیاسی، سماجی، معاشی و ثقافتی تاریخ میں پیش آنے والے ان واقعات اور سانحات کے بنیادی اسباب و محرکات کیا تھے۔ یہاں اس بات کا بھی اندیشہ رہا کہ کہیں وہ مقتدر

قوتیں، جنھوں نے ابتداء سے ہی اس نوزائیدہ مملکت کے وسائل اور اقتدار پر اپنا تسلط جمالیا تھا، یہ سب ان کی حاوی طاقت اور جبر کے استعماری بیانیوں کا نتیجہ تو نہیں۔ تاریخ کے انہی حقائق کو جاننے، سمجھنے اور انھیں منظرِ عام پر لانے کے لیے پاکستان کی حقیقی عصری تاریخ کے ایک معروضی اور موضوعی مطالعے کی ضرورت ابتداء سے ہی محسوس کی جاتی رہی ہے۔

پاکستان کی عصری تاریخ کے مقتدر بیانیوں کو سمجھنے میں وہ ادباء اور تخلیق کار زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جن کے تخلیقی متون میں اپنے عہد کی تاریخ کا حقیقی عکس ملفوف و مستور کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً قیامِ پاکستان کے پس منظر اور بعد از قیام کے سیاسی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی حالات کی تفہیم کے لیے سعادت حسن منٹو کے کئی افسانوی متون، عبداللہ حسین کا ناول اداس نسلیں، قرآۃ العین حیدر کا آگ کا دریا کا نصف آخر، انتظار حسین کے ہجرت کے تخلیقی تجربات پر مشتمل ناول، شوکت صدیقی کا خدا کی بستی اور جانگلوس اور غلام عباس کے وہ افسانے جو پاکستان کی ابتدائی سیاسی و سماجی صورتحال کا احاطہ کرتے ہیں نہایت اہم ہیں، اسی طرح سے فیض احمد فیض کی قیامِ پاکستان کے تناظر میں لکھی گئی شاعری، خواجہ معین الدین اور کمال احمد رضوی کے ڈرامے یہ سب ادبی و تخلیقی متون پاکستان کی ابتدائی عصری صورتحال کا مکمل احوال اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ بعد ازاں عبداللہ حسین کا ناول لوگ، مستنصر حسین تارڑ کا ناول راکھ، قرآۃ العین حیدر کا آخرِ شب کے ہم سفر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سانحے کے عکاس ہیں۔ اسی طرح عبداللہ حسین کے دیگر ناولوں رات، قید اور باگھ وغیرہ می، ں پاکستان کی عصری تاریخ کے کئی ادوار بین السطور پوشیدہ ہیں، جن کا نو تاریخی مطالعہ، پاکستان کی عصری تاریخ کی تفہیم میں ایک خاص اہمت کا حامل ہے۔ یہی نہیں بلکہ حبیب جالب اور احمد فراز کے شعری متون میں، غیر جموری قوتوں اور مارشل لاء کے خلاف مزاحمت اور انکار، کہیں اعلانیہ تو کہیں ملفوف و مستور انداز میں موجود ہے۔ احمد ندیم قاسمی، منشاء یاد اور رشید امجد کے افسانے پاکستان کی عصری و سیاسی صورتحال کے جبری و استعماری عناصر کو سمجھانے میں معاون ہیں۔ یہی نہیں بلکہ طاہرہ اقبال کے نیلی بار، نیلم احمد بشیر کے طاؤس فقط رنگ اور مستنصر حسین تارڑ کے قلعہ جنگی ایسے ناولوں میں پاکستان کی عصری تاریخ کے ساتھ ساتھ، پاکستان کی سیاست سے متصل عالمی سیاست کا منظر نامہ بھی پاکستان کی عصری تاریخ کی تفہیم میں کئی حوالوں سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ پاکستان کی حقیقی عصری تاریخ کی تشکیل میں ان نمایاں ادباء اور تخلیق کاروں کے تخلیقی ادبی متون کا نو تاریخی مطالعہ، کئی حوالوں سے نہ صرف پاکستان کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے بلکہ تاریخ کی ایک ایسی دستاویز بھی مرتب کر سکتا ہے، جو پاکستان کی تاریخ سے متعلقہ حالات و واقعات کا درست سیاسی، سماجی و ثقافتی شعور رکھتی ہو۔

نو تاریخیت ادب اور ثقافت کے باہمی رشتے کو باہم متصل دیکھتے ہوئے اور تاریخ کے حتمی اور جامع تصور کی نفی کرتے ہوئے، متن اور تاریخ کے مابین حائل اس فاصلے کو کالعدم قرار دیتی ہے، جو مقتدر قوتوں کے حاوی تاریخی بیانیوں کا پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ادب، تاریخ اور ثقافت کو ایک اکائی کی شکل میں دیکھتے ہوئے، ادبی و تاریخی متون کی ہم آہنگی کے رشتے کی بازیافت کرتی ہے اور ان ثقافتی شعریات کی بنیاد ڈالتی ہے جو ادب اور تاریخ کے درمیان ابتداء سے موجود رہی ہیں۔ مابعد جدیت کے زیرِ اثر فروغ پانے والے نو تاریخیت کے تنقیدی

رجحان کے، یہ اقدام لائقِ توصیف ہیں کہ جن کے سبب نہ صرف تاریخ کے درست، حقیقی اور مستند حقائق تک رسائی ممکن ہو سکی بلکہ ایک مستند ماضی کی تشکیلِ نو کی جانب بھی سمت نمائی ممکن ہو پائی۔

حوالہ جات:

1. http://www.kristisiegel.com/theory.htm
2. Sharad Rajimwale, Dictionary of Literary Terms, K S Paperbacks New Delhi, India. Pg296.
3. Stephen Green Blatt, 'Towards a Poetic of Culture' essay from 'New Historicism' compiled by H.Aram Veeser, published by Routledge Taylor and Francis Group London and New York, 2013. Pg11.
4. Raymond Williams, Culture and Materialism, Verso London New York2005.Pg44
5. Stephen Green Blatt, 'Towards a Poetic of Culture' essay from 'New Historicism' (page:2)
6. Michel Foucault, The Archaeology of Knowledge, Translated by A.M Sheridan Smith, published by Routledge London and New York, 1989. Pg 24

۷۔ عتیق اللہ، پروفیسر، تعصبات، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2005، ص۔99)

8. John Brannigan, New Historicism and Cultural Materialism, St Martin Publishers, New York, 1998, Pg 8
9. Michel Focult, The Arcchaeology of Knowledge, Paris 1989. (page: 120).

☆☆☆☆☆